POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 03-04 June 2024, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 85 واں سال

Date of Publication: 02-06-2024 • Price: 5/- • 1-14 June 2024 • Issue: 21,22 • Vol:83
یکم تا۱۴رجون ۲۰۲۴ء • شمارہ:۲۱،۲۲ • جلد:۸۳

مغرب میں انشائیے کی روایت

محمد اسداللہ

انشائیہ مغرب کی عطا کردہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جسے بجا طور پر نشاۃِ ثانیہ کا تحفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جاوید وششٹ اور بعض دیگر اہلِ قلم کے نزدیک ملاّ وجہی کی تصنیف 'سب رس' اردو انشائیہ کا اولین نقش ہے۔ بعض ناقدین سرسید اوران کے رفقا کی تحریروں کو انشائیہ کا نقطۂ آغاز مانتے ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں ابھرنے والے چند انشائیہ نگاروں کے متعلق بھی اس صنف کے موجد ہونے کا دعوا دہرایا گیا۔ ان متضاد بیانات کے باوجود یہ بات قابلِ تسلیم قرار دی جا سکتی ہے کہ اردو انشائیہ کا فنّی ارتقا مغربی ایسّے کا مرہونِ منت ہے۔ اس لحاظ سے مغرب میں انشائیے کی روایت کا مطالعہ اردو کی اس نوخیز صنف کی تفہیم میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

یہ انشائیہ تخلیقی اعتبار سے ایک زرخیز دور کی پیداوار ہے جس میں مخصوص فکری سانچوں اور عقائد کی قطعیت سے آزاد ہوکر اپنی تہذیبی روایات کی بازیافت کا رجحان پنپنے لگا تھا۔

ادبی تاریخ میں نشاۃِ ثانیہ کی آہٹیں سولہویں صدی کے دوسرے دہے سے سنائی دینے لگیں۔ 1578 تا 1625 اس کا زمانۂ عروج قرار دیا گیا ہے۔ اس دور کی خصوصیات ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان الفاظ میں بیان کی ہیں:

> 'نشاۃِ ثانیہ کوئی منظّم تحریک نہیں تھی۔ یہ ایک فضا تھی، نئی روشنی تھی جس نے آزاد خیالی اور جدید فکر وادب کے شعور کو بیدار کیا اور سارا مغرب جواب تک عیسائیت کے قلعے میں محصور تھا، شعور کے ساتھ نئے اصولوں کی تلاش میں لگ گیا۔'[۱]

نشاۃِ ثانیہ کی روح کو انشائیہ میں بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ فرانس انشائیہ کا مولد ہے لیکن وہاں اس کو خاطر خواہ فروغ حاصل نہیں ہوا۔ انشائیہ کی ایجاد سے متعلق ہاؤسٹن پیٹرسن لکھتے ہیں:

> 'انشائیہ کے باب میں اس فن کے نقوش ایک متعین تاریخ اور ایک مخصوص شخص تک تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ تاریخ 1580 ہے جب مونٹین نے اپنے تاثرات اور آرا پر مبنی پہلی دو کتابیں شائع کیں اور اس اصطلاح کو پہلی مرتبہ مخصوص معانی میں استعمال کیا۔'[۲]

بعض ناقدین کے نزدیک سینیکا Seneca (C.A.D.3-65) کے خطوط غیر رسمی ایسّے کا اولین نقش ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ خطوط یا دیگر اصناف میں ایسّے کی بعض خوبیاں دستیاب ہوں لیکن ایک جداگانہ صنف کی حیثیت سے یورپ میں ماشین کو انشائیہ کا نقطۂ آغاز تسلیم کیا جاتا ہے۔

ماشین Michel De Montagne (1533-1592)

ماشین انشائیہ کا جدِامجد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی منفرد تحریروں نے اس صنف کو بنیاد کا پہلا پتھر فراہم کیا۔ اس نے نہ صرف ایک نیا پیرایۂ اظہار وضع کیا بلکہ اس کے لیے ESSAI کا لفظ بھی تجویز کیا جو بعد میں انگریزی میں ESSAY کی شکل اختیار کر گیا۔ اس لفظ کے تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے ظہیرالدین مدنی رقم طراز ہیں:

> 'اسائی ESSAI عربی لفظ السعی کی فرانسیسی شکل معلوم ہوتی ہے، دونوں الفاظ کوشش کے معنی ومفہوم ظاہر کرتے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ لفظ اسّائی یونانی زبان سے فرانسیسی زبان میں آیا ہے مگر گمان غالب ہے کہ عربی لفظ السعی ہی اس کی اصل ہے۔ صدیوں تک اندلس اور جنوبی فرانس پر عربوں کا سکّہ چلتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے فرانسیسی زبان میں لاطینی سے بھی زیادہ عربی الفاظ رائج ہیں ممکن ہے اسّائی بھی ان میں سے ایک ہو۔'[۳]

ماشین کا اختیار کیا ہوا یہ لفظ اسّائی کوشش کے معنوں میں اس صنف کے لیے مناسب ہے کیوں کہ جن ذہنی وقلبی کیفیات اور اظہار کے تقاضوں نے انشائیہ کو ضبطِ تحریر میں لانے پر آمادہ کیا اور جس انداز میں اس نے اس صنف کو برتا اور انوکھا پیرایۂ اظہار وضع کیا۔ اسی میں اس صنف کے خدوخال اور فنی خصوصیات کی صورت گری کا وافر سامان موجود تھا۔ نشاۃِ ثانیہ کا عطیہ آزادیِ افکار ان تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔

میشل دی ماشین (MICHEL DE MONTAIGNE) نے 28 فروری 1533 کو فرانس کے ایک آسودہ گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ماشین اپنی ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی میں ایک ذہین اور حساس طالبِ علم کی حیثیت سے ابھرا۔ اسی دور میں فلسفہ بھی اس کے مطالعے میں رہا۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز قانون کے پیشے سے کیا۔ 1557 میں اسے میئر کے عہدے کے لیے بھی منتخب کیا گیا۔ اس کے مضامین کا مجموعہ 1580 میں منظرِ عام پر آیا۔

ماشین نے زندگی بھر کے تجربات اور مشاہدات کو اس طرح پیش کیا کہ اس کے انشائیے ان واقعات یا تاثرات کا اظہار نہ ہوکر خود انکشافی کا وسیلہ بن گئے۔ یوں بھی ماشین عام قسم کا آدمی نہیں تھا۔ اس کی درویشانہ صفت نے اسے ہنری آف ناروے کے دربار میں ایک اعلا عہدے کی پیشکش کو قبول کرنے سے باز رکھا۔ ماشین کے انشائیے اُس وقت تخلیق ہوئے جب اس کی زندگی ایک ٹھہراؤ سے دوچار ہوچکی تھی، اس کی تخلیقات اس کے تجربات اور مشاہدات کی باز آفرینی کا ایک ایسا ہنگام ثابت ہوئیں جہاں وہ دنیا سے کٹ کر اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی کا متلاشی تھا، اور یہی رجحان نشاۃِ ثانیہ کی جان تھا۔ اسی لیے غواصی کے اس عمل کے دوران ماشین جو اسلوب اور پیرایۂ اظہار لے کر ابھرا وہ اسی دور میں مقبولیت سے ہمکنار ہو گیا۔ جب ماشین کے انشائیے 1603 میں جان فلوریو نے انگریزی میں ترجمہ کیے تو وہ نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ جس طرزِ ادا کی اس نے بنیاد ڈالی تھی اس کی جڑیں انگریزی ادب میں گہری ہوتی چلی گئیں۔ ماشین کے انشائیے فکر و خیال کے نت نئے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔

ان میں اپنی ذات، کائنات اور نئے رابطے دریافت کرنے کا عمل ایک تخلیقی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ چوں کہ ماشین کے پیشِ نظر کوئی مخصوص مقصد نہیں تھا، اسی لیے اس کی سوچ وفکر آزادانہ طور پر اشیا کا محاسبہ کرتی ہے اور یہ تخلیقی تجربہ مسرور کن ثابت ہوتا ہے۔ اپنی تحریر کی غرض وغایت اس نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

'قارئینِ کرام! میری یہ کتاب دیانت کی امین ہے۔ اسے لکھنے کا واحد مقصد ذاتی اور داخلی ہے، اسے لکھتے ہوئے آپ کی خدمت یا اپنی شہرت کو ملحوظ نہیں رکھا کہ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں، میرے پیشِ نظر تو دوستوں اور عزیزوں کی مسرت ہے تاکہ جب میں مرجاؤں اور ایسا عنقریب ہونے والا ہے تو میرے کردار اور مزاج کی بازیافت سے مجھے اپنی یادوں میں زندہ رکھ سکیں۔ میرا مقصد دنیاوی ستائش ہوتا تو میں لباسِ فاخرہ زیبِ تن کرتا اور اپنے آپ کو ایک عالم کے روپ میں پیش کرتا۔ میں تو آپ کے سامنے تصنّع اور بناوٹ کے بغیر سادہ، فطری اور روزمرہ صورت میں آنا چاہتا ہوں وجہ یہ ہے کہ میں جس چیز کی تصویر کشی آپ کے سامنے کررہا ہوں وہ میں خود ہوں۔ میری کمزوریوں کا مطالعہ زندگی کے ساتھ کیجیے کیوں کہ میری فطرت زمانے کے تہذیبی معیار کو قبول کرتی ہے۔ اگر میں ان لوگوں میں ہوتا جنھیں قدرت کے آزاد قوانین نے بقاے دوام عطا کردی تو یقین جانیے میں آپ کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر بے نقاب کردیتا اور بے حد خوش ہوتا۔ قارئینِ کرام! میں خود اپنی کتاب کا موضوع ہوں اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنی فرصت کے اوقات اتنے معمولی اور بے مصرف موضوع کی نذر کردیں لہٰذا مانٹین آج یکم مارچ 1580 کو آپ کو الوداع کہتا ہے۔'[۴]

مانٹین نے انشائیہ کو تصنع اور بناوٹ سے پاک فطری، سادہ اور دلکش اسلوب کی بنیادوں پر استوار کیا، اس کے انشائیوں میں انکشافِ ذات اور ندرتِ خیال کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان میں خود کلامی کا انداز پایا جاتا ہے:

'میرا خیال تھا کہ میری طویل زندگی نے مجھے بالغ نظر بنا دیا ہے۔ رزم گہِ حیات سے میں نے جو تجربات سمیٹے تھے ان کے گہرے نقوش میرے ذہن پر مرتسم تھے اور اقتضاے وقت نے اب مجھے بے حد پختہ کردیا تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ بیکاری تو ذہن کو منتشر کردیتی ہے۔ اسے اضمحلال اور مایوسی کی آماجگاہ بنادیتی ہے۔ حالاں کہ ذہن تو مفرور گھوڑے کی مثال ہے جو اپنے مالک کے اصطبل سے آزاد ہونے کے بعد زیادہ مستعد اور پھرتیلا ہوجاتا ہے۔ اور جتنا کام پہلے وہ دوسروں کے لیے حالتِ جبر میں کرتا تھا، اب اس سے سوگنا زیادہ اپنے لیے کرسکتا ہے۔

اس تصور کے پیدا ہوتے ہی میرے ذہن نے بھی مفرور گھوڑے کی طرح دوڑنا شروع کردیا۔ اب سیکڑوں عجیب الخلقت باتیں، دیوہیکل افکار اور الجھے ہوئے تصورات، کسی نظم وضبط کے بغیر یکے بعد دیگرے مجھ پر یلغار کررہے تھے۔ میں ان کی مہملیت پر غور کررہا تھا۔ ان کے انوکھے زاویوں پر اطمینان اور سکون سے سوچ رہا تھا۔'[۵]

مانٹین کے ایسیز انشائیہ نگاری کا اولین نقش ہے۔ اس کے بعد اس صنف میں مزید رنگوں کا اضافہ ہوا۔ اپنے تقریباً چار سو سالہ ارتقائی سفر میں یہ صنف اسلوب، موضوع، مزاج اور آہنگ کے اعتبار سے نت نئی تبدیلیوں سے آشنا ہوئی۔ ایسّے نگاری کی اسی روایت نے ایسے صاحبِ طرز انشائیہ نگار پیدا کیے جن کا اسلوب ان کی انفرادی شناخت کا مظہر تھا۔ اسالیب کا یہ تنوع اس صنف کی آفاقی مقبولیت اور وسعتِ اظہار کا سبب بنا۔

بیکن Francis Bacon (1561–1626)

سر فرانسس بیکن انگریزی انشائیہ نگاروں کا باوا آدم تسلیم کیا جاتا ہے۔ مانٹین نے Essai کے عنوان سے فن پاروں کی تخلیق کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اسے فرانس میں کسی سحر طراز قلم نے نہ تھاما البتہ اس کی مقبولیت فرانس کی سرحدیں پار کرگئیں۔ جان فلوریو نے 1606 میں اس کی تحریروں کو ترجمہ کی شکل میں پیش کیا۔ ان سے متاثر ہوکر بیکن نے ایسّے نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ بیکن کی عبقری شخصیت، علمیت، ذہانت اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیت نے اس صنف کو مضبوط بنیادیں فراہم کردیں۔ فرانسیسی Essai انگریزی میں Essay بن گیا۔ انشائیے کی فرانس سے ہجرت اس نوخیز صنف کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ بیکن کے انشائیوں کے متعلق ڈیل ڈوراں نے لکھا ہے:

'بیکن کو مرصع کاری پسند نہ تھی وہ الفاظ کے زیاں سے متنفر تھا۔ اس لیے ایک چھوٹے سے فقرے میں وہ متاعِ دانش بھر دیتا ہے۔ یہ تمام ایسیز ایک یا دو جملوں کے اندر اندر زندگی کے اہم مسائل کے بارے میں عظیم خیالات کا نچوڑ پیش کردیتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اس کا مواد زیادہ بہتر ہے کہ اس کی پیش کش کا طریقہ، کیوں کہ نثر میں بیکن کی زبان اتنی ہی گراں مایہ ہے جتنی شاعری میں شیکسپیئر کی۔'[۶]

بیکن کی فطری ذہانت، مشاقی اور ریاضت نے اسے وہ رنگ و آہنگ عطا کیا کہ ہم بیکن اور مانٹین کے انشائیوں کا موازنہ کرتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے گویا یہ دونوں قطعی مختلف اسالیب کے علم بردار ہیں۔ بیکن کا انشائیہ فرانسیسی مزاج سے قدرے منحرف ہوکر انگریزوں کی طبعی خصوصیات کی غمازی کرتا ہے۔ انگریز فطرتاً کم آمیز اور ذاتی معاملات میں بہت کم کھل پاتا ہے۔ مانٹین کی تحریریں اس کے برعکس، بے تکلفی کے ساتھ قلم کار کے احوال بیان کرتی ہیں۔ بیکن نے اپنے مضامین میں، جنھیں اس نے اپنی ذہنی مشقوں کا ثمر قرار دیا ہے، روشنی کا دائرہ اپنی ذات پر مرکوز کرنے کے بجاے دنیا کی رنگینیوں کی طرف موڑ دیا۔ فارم کا پیمانہ تو اس نے مانٹین ہی کے میخانے سے اٹھایا مگر جو مے اس میں انڈیلی اس کا مزاج قدرے مختلف تھا۔ اس نے انشائیے کو جامِ جہاں نما بنادیا۔ اس طرح انگریزی میں انشائیے کو ایک نیا آغاز عطا ہوا۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی انگریزی انشائیے کے متعلق لکھتے ہیں:

''بیکن کی فطرت اور انگریز قوم کی خصوصیت نے اسے بالکل نئی چیز بنادیا۔ انگریز قوم کی اپنی اندرونی زندگی سے زیادہ دنیا کی گوناگوں دلچسپی نے بیکن کے انشائیے کو زندگی کے ہر پہلو کا آئینہ دار بنادیا۔'[۷]

بیکن بنیادی طور پر فلسفیانہ مزاج اور استدلالی ذہن کا مالک تھا۔ 1586 میں اس نے Greatest Birth Of Time کے عنوان سے ایک فلسفیانہ مقالہ قلم بند کیا۔ اس کا مقالہ The Advancement of learning بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ مانٹین نے علمی و تحقیقی مقالات کی زبان کو جس قطعیت، سنگلاخی اور خشکی سے آزاد کرکے لطیف تر، لچکدار اور غیر رسمی و تخیلی انداز کا خوگر بنایا، اس نثر کا واسطہ بیکن سے پڑا تو اس پر بیکن کے فلسفیانہ اندازِ فکر کا دباؤ پڑنا لازمی تھا۔ اس نے ایسی مناسب و موافق حدت کے ساتھ اس میں فلسفیانہ فکر کی آمیزش کی کہ یہ اہتمام انشائیے کا حسن بن کر ابھر آیا۔ بیشتر مقامات پر اس کا یہ فن خود اس کی ذات کا پردہ ثابت ہوا، اسی لیے اس کی تحریروں میں انشائیہ نگار کی ذات کا انکشاف کھل کر نہیں ہو پایا۔

بیکن نے ان مضامین میں حسنِ اختصار اور جامعیت کے ساتھ نئے موضوعات پر حکمت و دانش کا خزانہ سمودیا۔ اس نے غیر معمولی پہلوؤں کو فلسفیانہ سوچ کے لمس سے غیر معمولی بنا کر معاصر زندگی کے امور کو اپنے زاویۂ نگاہ سے پیش کیا۔ اسی علم، حکمت اور فلسفیانہ رنگ کے سبب اس کی تحریروں کے بیشتر ٹکڑے انگریزی زبان کے محاورے بن گئے۔ یہ اس کی پُر اثر اور قد آور شخصیت کا کمال تھا کہ اسے نشاۃِ ثانیہ کی روح اور تخلیقی توانائی کی علامت قرار دیا گیا۔ اس کے مضامین کا بڑا حصہ آج بھی حوالوں کے طور پر استعمال ہوتا ہے مثلاً یہ قول:

'کچھ کتابیں محض چکھنے کے لیے ہوتی ہیں، بعض نگلنے کے لیے مگر بہت کم ایسی ہیں جنھیں چبا کر ہضم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔'

بیکن کے مضامین کا مجموعہ 1597 میں منظرِ عام پر آیا جس میں دس مضامین تھے۔ یہ مجموعہ Essay کے نام سے شائع ہوا۔ جنھیں اس نے Dispersed Meditation یعنی افکارِ پریشاں قرار دیا۔ بیکن نے اپنے نئے اور پرانے مضامین کو یکجا کرکے 1625 میں جو کتاب شائع کی اس میں کل 85 ایسیز تھے جن میں سے بعض کو نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ پیش کیا گیا تھا۔ ان مضامین میں ابھرنے والا بیکن کا اندازِ فکر Baconian Wisdom کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے عنوانات اپنی ندرت اور انوکھے پن کے سبب دلکش ہیں۔

Of life,Of Study, Of Gardens, Of Praise,

Of Flowers and friends, Of love,

Of Marriage and single life

بیکن کے مضامین میں نفسِ مضمون کو دیگر موضوعات سے موازنہ کرکے نئی روشنی میں پیش کرنے کا انداز نمایاں ہے۔ اس کے خیالات میں پریشاں فکری کے ساتھ موضوع سے مربوط رہنے کا عمل موضوع پر اس کی گرفت کو مضبوط تر کردیتا ہے۔ ان دونوں متضاد عناصر کا امتزاج انشائیہ میں دلکشی پیدا کرتا ہے۔ بیکن کے مشہور انشائیے Of Gardens کے اس اقتباس سے اس کے اسلوب کی اس خوبی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے باغ اگایا۔ وجہ یہ ہے کہ باغ انسانی زندگی کو نہ صرف خالص مسرت عطا کرتے ہیں بلکہ انسانی روح کو بھی تازہ کردیتے ہیں۔ باغوں کے بغیر محلات اور عمارتیں دستکاری کے محض ادنیٰ نمونے ہیں اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسان جب تہذیب و لطافت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تو عمارتوں کو بعد میں پرشکوہ بناتا ہے لیکن باغات کو نفاستِ طبع سے پہلے آراستہ کرتا ہے، وجہ یہ ہے کہ باغ کمالِ فن کے زیادہ متقاضی ہیں، کاش سرکاری طور پر یہ حکم بھی جاری کردیا جائے کہ سال کے سب مہینوں میں باغ اگانے کا کام جاری رکھا جائے تاکہ حسین اور خوشنما پھول سب موسموں میں ہماری آنکھوں کے سامنے لہلہاتے رہیں۔'[۸]

بیکن کا انشائیہ نگاری کا فن اس کے اسلوب کے ساتھ ہی اس کی نظر اور زندگی کو دیکھنے کے اس انداز میں پوشیدہ ہے جس کے شواہد ہمیں اس کے انشائیوں میں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ اردو انشائیوں پر بیکن کی انشائیہ نگاری کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

''ہمارے ہاں انشائیہ میں اختصار اور اس کی ناتمامی پر زور دینے والے ناقدین نے یقیناً بیکن کے ایسیز کی مثال سامنے رکھی ہوگی، لیکن ان حضرات کے پاس نہ تو بیکن جیسا ذہن تھا نہ مختصر فقرات میں معانی کی بجلیاں بھر دینے والا اسلوب تھا اور نہ ہی ویسا علم و دانش، اس لیے ان کے ناتمام انشائیے پڑھ کر Loose sally of mind کا احساس ہوتا ہے... ہمارے ہاں جو حضرات انشائیہ کو زندگی، اس کے تنوع، گہری سوچ اور فلسفیانہ استدلال سے الگ رکھنا چاہتے ہیں وہ اگر بیکن کا مطالعہ کریں تو انھیں علم ہوجائے گا کہ انگریزی میں ایسّے کو متعارف اور مقبول کرانے والا بیکن، فلسفیانہ نگاہ اور فلسفیانہ سوچ کے علاوہ اور کچھ تھا ہی نہیں''۔[۹]

...(بقیہ صفحہ 6 پر)

علاّمہ اقبالؔ مساواتِ انسانی کے علم بردار

عارف عزیز

علامہ اقبالؔ کے ناداں پرستاروں اور دانا دشمنوں نے انھیں ایک متنازعہ شخصیت کا درجہ دے دیا ہے، کسی کے نزدیک وہ شاعرِ کم اور مسلمان زیادہ تھے، کوئی انھیں پاکستان کا بانی اور تقسیمِ ہند کا ذمے دار قرار دیتا ہے، حالاں کہ اقبال کی فکر ونظر کا تجزیہ ان حالات کے پس منظر میں ہونا چاہیے، جن میں ان کی حیات کا بیشتر حصہ صرف ہوا، 'فکرِ اقبال کی معنویت' پر روشنی ڈالنے سے قبل یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ شاعرِ مشرق قومیت کے لحاظ سے ہندستانی، مذہباً مسلمان اور خود کو عالمگیر انسان برادری کا ایک فرد مانتے تھے۔ ان کے زمانے کا ہندستان برطانوی استعمار کے زیرِ نگیں تھا۔ ان کا عہد 1877 سے 1938 تک کوئی 61 برس پر مشتمل ہے، یہی وہ زمانہ ہے جس میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان انگریزوں کی طرف سے بوئے گئے تفریق کے بیج برگ وبار لا رہے تھے اور بعض سیاست دانوں کے طفیل دونوں فرقوں میں شدت پسندی بڑھ رہی تھی۔ مسلمان جہاں اپنی نشاۃِ ثانیہ کے لیے سرگرمِ عمل تھے، وہیں ہندو بھی تنگ نظری کا شکار بن گئے تھے۔ اس ماحول وفضا میں جب انسان کو بحیثیت انسان نہیں، مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے دیکھا جا رہا تھا تب اقبال نے یہ کہہ کر مساواتِ انسانی کا درس دیا:

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا نوعِ انسانی کو
اخوت کی زباں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

اقبال نے فلسفے کے ہندستانی ذخائر کو خود چھانا اور دوسروں کو بھی اس سے فیض یاب کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس ملک میں صدیوں سے دوسری قوموں کی آمد جاری ہے، ہون آئے، کشان آئے، دراوڑ آئے، آرین آئے لیکن اس سرزمین نے سب کو اپنا لیا، بعد میں منوواد نے ہندستانی سماج میں اثر ورسوخ حاصل کر کے تنگ نظری کو ہوا دی تو معاشرے نے دوسروں کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت کھو دی، گوتم بدھ نے جو ہندستان میں پیدا ہوئے، اس تنگ نظری کو توڑنا چاہا، لیکن برہمن ازم نے گوتم کی رواداری کو پنپنے نہیں دیا، یہاں تک کہ اس مذہب کا دیس نکالا ہو گیا۔ اقبال اس عمل کو انسانیت کے خلاف قرار دے کر شاکی ہیں:

قوم نے پیغام گوتم کی، ذرا پرواہ نہ کی
قدر پہچانی نہ، اپنے گوہر یک دانہ کی
برہمن سرشار ہے، اب تک مے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے، محفلِ اغیار میں

اقبال کی وفات کو پون صدی ہو گئی ہے، اس عرصے میں دنیا کے حالات میں کیا تبدیلی آئی اور یہ اقبال کے تصورات کے مطابق تھی یا برعکس، اس کا جائزہ کلامِ اقبال کو عہدِ حاضر کی روشنی میں سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ دوسری طرف یہ اندازہ لگانے میں بھی کہ اقبال انسانی جذبات واحساسات کے کتنے بڑے ترجمان ہیں۔ اقبال کے زمانے میں نیوکلیر اسلحہ کا فروغ نہیں ہوا، پھر بھی انھوں نے افرنگ کو مشینوں کے دھوئیں سے سیہ پوش دیکھ لیا، اور اس کے نتائج انسانی زندگی پر جس طرح نمودار ہو رہے تھے، اس سے لوگوں کو خبردار بھی کیا:

بہت دیکھے ہیں میں نے، مشرق ومغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا
لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے، مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

اقبال مادی ترقیات کے خلاف نہیں تھے لیکن ان کو یہ تشویش ضرور تھی کہ تہذیبِ عصر، بالخصوص مغربیت ایک خود رو جنگل کی طرح پھیل رہی ہے، جس کا کوئی مرکزِ ثقل نہیں ہے۔ اگر یہ ترقی انسانیت کی سربلندی کے لیے ہوتی تو منشائے فطرت کے عین مطابق تھی، لیکن یہ انسانیت کے زوال کو ظاہر کرتی ہے۔ اوپر کی طرف دیکھنے کی ترغیب نہیں دیتی بلکہ اس میں روک بنتی ہے، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ انسان کی بے تعلقی، خلقی رشتوں کی سرد مہری اور ایک قسم کی بے کیفی زندگی کا مظہر بن چکی ہے:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

اقبال کے زمانے میں مغربی دنیا کی نمائندگی سلطنتِ برطانیہ کرتی تھی۔ مغرب کے تعلق سے اقبال کے تمام افکار ونظریات اس ملک کی تہذیب وتمدن کے حوالے سے ہیں، لیکن عصرِ حاضر میں مغربی تہذیب کا مرکزِ ثقل امریکہ بن گیا ہے، جہاں کی روز افزوں صنعتی وزرعی پیداوار کے باوجود امریکی سیاہ فام آج زندگی کی آرام وآسائش سے محروم ہیں، اس کے برخلاف سفید فام امریکی زندگی کی لایعنیت اور عدمِ تحفظ کے احساس سے مختلف تناؤ میں گرفتار ہے۔ امریکہ کی معیشت کا انحصار اسلحہ سازی پر ہے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو اسلحہ تیار ہو، وہ فروخت بھی ہو جائے، اس غرض سے دنیا کے مختلف علاقوں میں سرد جنگ اور کبھی کبھی گرم جنگ کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے، بہ الفاظِ دیگر انسان اور انسان کے درمیان نفرت، حقارت اور دشمنی کو پروان چڑھا کر، قتل وغارت گری کا بازار گرم کرتے رہنا امریکی ڈپلومیسی کی بنیاد ہے۔ اس کے بغیر وہاں کی معیشت اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکتی، اقبال جب کہتے ہیں:

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

تو وہ اس مہلک حکمتِ عملی کو ہدف بناتے ہیں، جس کی نمائندگی آج امریکہ کے ذریعے ہو رہی ہے اور اس کی سب سے زیادہ زد تیسری دنیا کے عام انسان اور پوری انسانیت پر پڑ رہی ہے۔

شعرِ اقبال میں آزادی کو انسانی زندگی کی فلاح وترقی کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔ اقبال کے خیال میں جہاں آزادی نہیں وہاں زندگی کی قوت برقرار نہیں رہ سکتی۔ غلامی انسان کی متعدد خوبیوں کو فنا کر دیتی ہے اور آزادی سے محرومی گویا انسانیت سے محرومی ہے۔ اسی طرح اقبال محبت کو جو انسانیت، اخوت اور رواداری کی روح ہے، دنیا کے فتح کرنے کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے افراد اور اقوام کی زندگی میں ترقی وکامیابی کے ضامن تین اصولوں کی نشاندہی کی ہے: اول یقینِ محکم، دوم عملِ پیہم اور سوم محبت جو فاتحِ عالم ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

محبت ہی سے پائی ہے، شفا بیمار قوموں نے

شاعرِ مشرق کے نزدیک انسان کسی بھی نسل، فرقے یا جماعت سے تعلق رکھتا ہو، اس سے امتیاز برتنا جرم ہے کیوں کہ اس انسان کو وجود بخشنے والا ایک ہے، جب اس نے بنی نوعِ انسان کے لیے ہوا، پانی، غذا اور روشنی کے انتظام میں کوئی تفریق نہیں برتی اور یکساں طور پر سب کے لیے اس کو مہیا کیا تو انسانوں کے لیے یہ کیوں کر مناسب ہے کہ وہ باہم تفرقہ اندازی سے کام لیں، اس کا پیغام، پیغمبروں، اوتاروں، مصلحوں اور بزرگوں نے بھی دیا ہے:

شکتی بھی شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
ہم دیش واسیوں کی مکتی، پریت میں ہے

اقبال اپنے اشعار کے ذریعے جس خودی کی تعلیم دیتے ہیں، وہ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، تمام انسانوں کے لیے ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی خودی کی تکمیل مذہب کی اعلا قدروں میں مضمر ہے، اسی لیے اقبال نے اپنی شاعری کا موضوع انسان کو بنایا ہے اور انسانیت کے مسائل حل کرنا وہ اپنی شاعری کا مقصد قرار دیتے ہیں۔ ایک ایسے عہد میں جب قومی ووطنی عصبیت کا بول بالا ہے، ایک ملک کا انسان دوسرے ملک کے انسان کو گوارہ نہیں کرتا اور ایک فرقہ دوسرے فرقے کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے، اقبال نے پوری جرأت مندی کا مظاہرہ کر کے اس رویّے کو ننگِ انسانیت قرار دیا ہے:

یہی آدم ہے سلطان، بحر وبر کا
کہو کیا ماجرا، اس بے بصر کا
نہ خودبیں، خدابین جہاں بیں
یہی شہ کار ہے، تیرے ہنر کا

کلامِ اقبال میں انسانیت کی معراج کا سب سے بڑا مرقع اور دنیائے شاعری کا عظیم تر شاہکار 'جاوید نامہ' میں پیش کیا گیا ہے۔ 'جاوید نامہ' کی بامعنی تمہید کے بعد اقبال افلاک کی سیر کراتے ہیں، اس میں بلاامتیازِ مذہب وملت دنیا کے مختلف حصوں میں رونما ہونے والے اہم واقعات، موضوعات اور شخصیات کو ایسی بصیرت کے ساتھ زیرِ بحث لاتے ہیں کہ انفس وآفاق سب روشن ہو جاتے ہیں۔ اس کا یہ شعر تو آفاقی شاعری اور انسان دوستی کے دستاویز کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا:

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

کلامِ اقبال کی ان ہی وسعتوں کا مطالعہ کرنے سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے بیسویں صدی ہی نہیں، اکیسوی صدی کو کتنا کچھ دیا ہے۔ 'بانگِ درا'، 'بالِ جبریل'، 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' کے صفحات میں موجود اردو وفارسی کلام یا یادگار خطبات، دل کو چھو لینے والا 'ترانۂ ہندی'، 'ہندستانی بچوں کا قومی گیت'، 'گوتم بدھ'، 'شری رام'، 'گرونانک' اور 'سوامی تیرتھ' جیسی روحانی ہستیوں کو خراجِ عقیدت، 'گائتری منتر' کا شستہ اردو میں ترجمہ اور 'برہمن سے خطاب' انتہائی بصیرت افروز اور سبق آموز ہیں، جو ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔

ہر بلند پایہ تخلیق کار کی طرح اقبال کو بھی ترسیل وابلاغ کی تنگ دامنی کا احساس ہے۔ اس سے پہلے غالب بھی یہی گلہ کرتے نظر آتے ہیں، اسی میں ان دونوں شاعروں کی عظمت کا راز پنہاں ہے، لیکن اقبال کا یہ امتیاز ہے کہ وہ اپنے فکر وفن کے ذریعے ماضی کو حال میں پیوست کر دینا چاہتے ہیں تاکہ انسانی زندگی کی وحدت میں قوت وتاثیر پیدا ہو اور شرفِ انسانی کی جڑیں زیادہ گہری ومستحکم ہو جائیں۔ اس کوشش کو وہ کھوئے ہوئے کی جستجو سے تعبیر کرتے ہیں، ان کے

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

اردو دُنیا

بہار میں اساتذہ کی تقرری کے لیے
امتحان کی تاریخوں کا اعلان

پٹنہ (2 جون)۔ بہار پبلک سروس کمیشن کے ذریعے تیسرے مرحلے کی اساتذہ تقرری کے امتحان کی تاریخوں کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ امتحانات 27 جون سے 30 جون تک منعقد کیے جائیں گے۔ اس تعلق سے بی پی ایس سی نے سبھی اضلاع کے ڈی ایم کو مکتوب ارسال کیا ہے جس میں انھیں امتحان مراکز کی فہرست مرتّب کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ بی پی ایس سی کے نوٹیفکیشن کے مطابق ایک سے پانچ، چھے سے آٹھ، نو سے دسویں کلاس اور گیارہویں سے بارہویں کلاس تک کے اساتذہ کے لیے یہ امتحان منعقد کیا جائے گا۔ سبھی ڈی ایم سے 6 جون تک امتحان مراکز کی فہرست طلب کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ پٹنہ ہائی کورٹ نے 29 مئی کو تیسرے مرحلے کی اساتذہ تقرری پر روک لگا دی تھی۔ دوبارہ امتحان منعقد کیے جانے سے قبل ہائی کورٹ نے پلس ٹو اسکول کے گیسٹ ٹیچر کو تجربے کی بنیاد پر ترجیح دیے جانے کے معاملے میں اسٹے لگا دیا تھا۔ (انقلاب۔دہلی)

اردو میں نام کی تختی اور سائن بورڈ لگانے کی مُہم کا افتتاح

نئی دہلی (26 مئی)۔روزمرہ کی زندگی اور صنعت وتجارت سے دور ہوتی اردو کی زبوں حالی کا اظہار کرتے ہوئے اوکھلا پریس کلب (رجسٹرڈ) نے اردو کو پورے ملک میں دکانوں، دفاتر اور مکانوں تک پہنچانے کا عزم کیا ہے۔ یہ عزم اوکھلا پریس کلب نے دوکانوں اور مکانوں پر اردو میں نام کی تختی اور سائن بورڈ لگانے کی مہم کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ اوکھلا پریس کلب کور کمیٹی کے ارکان میں سے سینئر صحافی ڈاکٹر اطہر الدین (منے بھارتی)، سینئر صحافی سہیل انجم، ڈوپچے ویلے سے وابستہ جاوید اختر، ڈاکٹر خالد رضا خاں، یو این آئی کے عابد انور، خرم شہزاد، 'ملّت ٹائمس' کے شمس تبریز قاسمی، سیف اللہ صدیقی اور ظہیر الحسن نے 'اپنے گھر، دوکان میں اردو میں بورڈ لگائیں، اردو کو فروغ دیں' کے نام سے مہم کا افتتاح مشترکہ طور پر کیا۔ اوکھلا پریس کلب کی کوشش ہے کہ اس مہم کے ذریعے نہ صرف پورے جامعہ نگر کے باشندوں، دکان داروں، دفاتر، تعلیمی اداروں اور مساجد و درگاہوں میں اردو میں بورڈ لگائے جائیں بلکہ ملک گیر سطح پر اس مہم کو انجام دیا جائے۔ اس کی شروعات کرتے ہوئے اوکھلا پریس کلب کور کمیٹی کے ارکان نے اپنے گھروں میں اردو میں نام کی تختی لگائی ہے اور اس مہم کو عوامی مہم بنانے کے لیے جگہ جگہ پوسٹر چسپاں کر رہے ہیں۔ اوکھلا پریس کلب کے ارکان اردو میں بورڈ بنانے کے لیے تعاون بھی کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ جامعہ نگر کو چھوٹا ہندستان بھی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یہاں پورے ملک کے مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ رہتا ہے۔ یہیں پر مشہور یونی ورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ہے، اس کے علاوہ ہندستان کی بڑی تنظیموں کے دفاتر بھی یہاں واقع ہیں۔

(انقلاب۔دہلی)

دلّی کی عمارات پر قدیم ترین مخطوطے کی برٹش لائبریری میں بازیافت

انجمن ترقی اردو (ہند) کی نئی اشاعت دہلی کی تاریخ نویسی کا رُخ تبدیل کردے گی

نئی دہلی (6 جون)۔ دلّی تاریخ کا ایسا خزینہ ہے جہاں بہ قولِ مولانا الطاف حسین حالی 'چپے چپے پر گوہر یکتا تہِ خاک ہیں' اس لیے آج بھی دلّی کی تاریخ پر ہوش ربا علمی کام انگریزی اور دیگر ہندستانی زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی دلّی کی تاریخ کا تسلط خوش گوار اور جینے کا حوصلہ دیتا ہے نیز اس تاریخ کی عظمت کا احساس دلاتا ہے جسے تباہ کرنے کی ہر ممکن سازشیں ہر طرف سے کی جاتی رہی ہیں۔

دلّی دنیا کی تاریخ کے قدیم ترین شہروں میں ہے۔ یہاں کی عمارات تاریخِ عالم کو سمجھنے کا ہمیشہ ایک اہم وسیلہ رہی ہے۔ شاہ جہاں آباد سے پہلے کی قدیم یا اُردو محاورے میں کہیں تو پرانی دلّی کا مہتم بالشان سلسلہ سلطنتِ عہد سے لے کر عہدِ عتیق تک چلا گیا ہے۔

دلّی کی تاریخ پر عمارات کے حوالے سے سب سے مشہور کتاب سرسیّد کی 'آثار الصنادید' ہے۔ اب سے کچھ برس پہلے تک اس نوعیت کی دیگر کتابوں سے عام قاری واقف نہیں تھا۔ دلّی یونی ورسٹی میں فارسی کے استاد اور دلّی کے ایک قدیم علمی و مذہبی خانوادۂ مولانا اخلاق حسین قاسمی کے رکن نیز مولانا مرحوم کے صاحبزادے پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب نے ہر چند کہ 1982 میں 'آثار الصنادید' سے بھی پہلے کے ایک مخطوطے 'سیر المنازل' کو شائع کیا تھا جس میں دہلی کی عمارات کے وہ تمام کتبات موجود ہیں جو 'آثار الصنادید' میں نقل ہوئے ہیں مگر یہ مخطوطہ 2022 میں اپنے نئے اردو ترجمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو (ہند) سے اشاعت کے بعد شاید اس لیے علمی دنیا میں مروّج ہوا کیوں کہ تب تک دہلی کی تاریخ میں لوگوں کی دل چسپی بہت بڑھ گئی تھی۔

دہلی کی تاریخ اپنے سب سے بڑے علمی ذخائر کا انتظار کر رہی تھی جو جلد ہی زیورِ اشاعت سے مزین ہو کر دہلی کی تاریخ کے شائقین کے ہاتھوں میں ہوگا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی جن کی دہلی کی تاریخ میں دل چسپی معروف ہے اور جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے اہم متون کے انگریزی ترجمے بھی کر رہے ہیں، نے دہلی کی عمارات کے کتبوں کا وہ اولین فارسی مخطوطہ تلاش کر لیا ہے جو اب تک پردۂ خفا میں برٹش لائبریری کے کسی گوشے میں اپنی پذیرائی کا منتظر تھا۔ یہ 1817 کا مخطوطہ ہے جس میں وہ تمام کتبے موجود ہیں جو 'آثار الصنادید' ہی نہیں بلکہ 'سیر المنازل' میں نقل ہوئے ہیں، یعنی ان دونوں کتابوں کا منبع و ماخذ یہ مخطوطہ بہ نام نسخۂ حفیظ الدین احمد ہی ہے۔ سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ اس مخطوطے کا کاتب خود سنگین بیگ یعنی 'سیر المنازل' کا مصنف ہے۔ اس مخطوطے کے مولف عِیار دانش کے مترجم حفیظ الدین احمد ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے پیش رَو ادارے نیٹو کالج (Native College) سے وابستہ رہے تھے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) جلد ہی اس مخطوطے کو شائع کر رہی ہے جو یہ اشاعت دلّی کی تاریخ نویسی میں ایک انقلاب کا محرک ہوگی۔ انجمن نے گزشتہ برس اپنے 103 برس پرانے مجلّے 'اردو ادب' کا بے مثال شاہ جہان آباد نمبر شائع کر کے ثابت کر دیا تھا کہ اردو میں ابھی بھی طبع زاد تحریریں تاریخ جیسے موضوع پر انگریزی سے بہتر تحریر کی جا سکتی ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ کی توسیعی میٹنگ منعقد

رانچی (9 جون، پریس ریلیز)۔ انجمن ترقی اردو (ہند) جھارکھنڈ کی توسیعی میٹنگ کا انعقاد 9 جون 2024 کو شاہنواز خاں کی صدارت میں کیا گیا جس میں ہزاری باغ، جمشید پور، رانچی، دھنباد، گریڈیہ، گملا، چترا، ڈالٹن گنج، گڈا، جامتاڑا، کوڈرما کے نمائندے شامل ہوئے۔

میٹنگ کی شروعات کرتے ہوئے مرکزی نمائندہ ایم زیڈ خان نے کہا کہ سرکار کے حالیہ سرکلر میں اردو کو مقامی زبان کے زمرے سے ہٹا دیا گیا ہے جس کے سبب مجوزہ سروے میں اردو زبان کے سروے کے امکانات معدوم ہو گئے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اردو زبان کو ختم کرنے اور زبان کے فروغ کے راستے مسدود کرنے جیسا ہے۔ اگر ہم نے بروقت احتجاج نہیں کیا تو آنے والی نسلیں اس کا خمیازہ بھگتیں گی۔

مرکزی نمائندے کی حیثیت سے ایک احتجاجی مکتوب سکریٹری محکمۂ تعلیم کو بہ ذریعۂ ای میل بھیجا گیا ہے اور ضلع کے کنوینر اور سکریٹری سے بھی درخواست کی گئی ہے کہ احتجاجی مکتوب سکریٹری محکمۂ تعلیم کو بھیجیں تاکہ دباو بن سکے۔

انتخاب کی تاریخ کے تعین کے سلسلے میں مرکزی نمائندے نے کہا کہ چار اضلاع کا انتخابی عمل مکمل ہو چکا ہے، بقیہ اضلاع میں جلد انتخاب کرا لیا جائے تاکہ جھارکھنڈ میں انجمن کا تنظیمی ڈھانچہ کھڑا ہو جائے۔

ہزاری باغ انجمن ترقی اردو کے نومنتخب صدر ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے سروے لسٹ میں اردو کی عدمِ شمولیت پر اپنی گہری ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ اردو کے ساتھ زیادتی ہے۔ سکریٹری کے علاوہ وزیر اعلا جھارکھنڈ کو بھی احتجاجی مکتوب ارسال کیا جائے اور انجمن کا ایک وفد ان سے مل کر اردو مسائل سے روبرو کرائے اور میمورنڈم سپرد کرے۔

جمشید پور انجمن کے نومنتخب صدر ضیاء المبین اور سکریٹری سمیع احمد خان نے وزیر اعلا کو احتجاجی مراسلہ بھیجنے کی بات کہی۔

رانچی کے نمائندے توحید عالم، محمد قاسم اور یاسمین لال نے اس کے خلاف احتجاجی آواز بلند کرنے کی بات کہی۔

گڈا کے کنوینر سلیمان جہانگیر اور جامتاڑا کے نمائندے شمیم اختر نے بھی ریاستی کمیٹی کی جانب سے احتجاجی ای میل اور مراسلہ بھیجنے کی بات پر اتفاق کیا۔ گریڈیہ کے کنوینر ڈاکٹر غلام صمدانی نے علاقائی سطح پر احتجاج کر کے سرکار پر دباو بنانے کی بات کہی۔

کوڈرما کے احمد جامی، چترا کے محمد اعظم، دھنباد کے ایس ایم رضوی اور ڈالٹن گنج کے ڈاکٹر انتخاب عالم نے حالیہ سروے لسٹ میں اردو کی عدمِ شمولیت پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے سوچی سمجھی سازش بتایا۔

شاہنواز خان نے اپنے صدارتی خطاب میں اردو آبادی کو انتباہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنی ثقافت وتہذیب اور کلچر کو بچانا ہے تو اردو کے تئیں اپنی ذمے داری کو سنجیدگی سے لیں ورنہ فاسسٹ لوگ اسے مٹانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اردو کے لیے وقت نکالیے۔ دشمنوں کی سازش کو سمجھیے۔ انجمن ترقی اردو جھارکھنڈ کو مضبوط کیجیے۔ ضلع کے انتخاب کو جلد مکمل کریں تاکہ انجمن کا مضبوط ڈھانچہ جھارکھنڈ میں کھڑا ہو سکے۔

آن لائن میٹنگ میں اتفاق رائے سے درج ذیل فیصلے لیے گئے:

1- ہر ضلع سے احتجاجی ای میل سکریٹری محکمۂ تعلیم کو بھیجا جائے۔
2- وزیر اعلا جھارکھنڈ کو آج کی میٹنگ کا حوالہ دیتے ہوئے ریاستی کمیٹی کی جانب سے احتجاجی مراسلہ بھیجا جائے۔
3- بقیہ اضلاع میں انتخابی عمل جلد از جلد مکمل کر لیا جائے۔

شرکائے مجلس میں رخسار پروین، انم اعظم، محمد نثار، آصف علی، ولی اللہ، شہزاد پرویز، محمد سجاد حسین، گوہر علی خان، افروز عالم، محمد نثار نارائن پوری وغیرہ شامل رہے۔

گرامی نامہ—

چند واقعات اور یادیں

(مولوی عبدالحق اور سرسیّد کے ذکرِ خیر سے)

مکرمی! موجودہ حالات میں ڈاک کی بدنظمی کے باعث ہفت روزہ 'ہماری زبان' کئی شماروں کے ساتھ بہ ذریعۂ اسپیڈ پوسٹ تاخیر سے دستیاب ہوتا ہے۔ 'ہماری زبان' ایسا جریدہ ہے جس کی قدر و قیمت، وقعت اور معنویت تازہ ہی رہتی ہے۔

ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے 8 تا 14 فروری 2024 کے شمارے میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب کا مضمون بہ عنوان 'ذکرِ شبلی نو دریافت خود نوشتوں میں' شائع ہوا ہے۔

متذکرہ بالا عنوان کے مضمون میں مولوی عبدالحافظ باعکظہ کی تحریر اس طرح درج ہے:

'22 جنوری 1898 کی صبح تھی کہ ہم علی گڑھ پہنچے اور حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب رئیس دتاولی کی کوٹھی پر مقیم ہوئے اور خوش قسمتی سے پہلے ہی روز سرسیّد احمد خاں، سیّد محمود صاحب، مولانا حالی، مولانا شبلی کی زیارت نصیب ہوئی۔'

اور مضمون نگار محمد الیاس الاعظمی صاحب بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ:

'اہلِ علم اس بات سے واقف ہیں کہ بابائے اردو، علامہ شبلی کے شاگرد تھے اور علی گڑھ میں ان سے باقاعدہ پڑھا تھا۔'

مندرجہ بالا تحریریں پڑھ کر چند واقعات بے ساختہ میرے ذہن میں آ گئے۔

حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب کی کوٹھی (دولت کدہ) کا نام 'دارالانس' تھا۔

سرسیّد احمد خاں اور ان کے فرزند سیّد محمود صاحب کی ذاتی نااتفاقی اور تکرار کے سبب سرسیّد صاحب کے دوست حاجی محمد اسماعیل خاں، سرسیّد کی قیام گاہ 'سرسیّد ہاؤس' (جس کے اصلی مالک جسٹس سیّد محمود تھے) سے ان کو اپنے ہمراہ اپنی رہائش گاہ 'دارالانس' لے آئے، وہیں سرسیّد احمد خاں نے 27 مارچ 1898 کو جامِ بقا نوش کیا۔

1970 میں میرے بھائی جان ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب (جو اُس زمانے میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں لکچرر تھے) 'دارالانس' کے ایک حصے میں کرایے پر رہتے تھے۔ اُس وقت تک بھائی جان کا ذاتی مکان بہ مقام سرسیّد نگر تعمیر نہیں ہوا تھا۔ میں راقم الحروف احمد مکرم موسمِ گرما کی تعطیل میں تقریباً ایک ماہ 'دارالانس' میں قیام پذیر رہا۔

مضمون نگار محمد الیاس الاعظمی صاحب کی تحریرِ بالا میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا تذکرہ آیا ہے۔ 61-1960 میں ناچیز احمد مکرم، حلیم مسلم انٹر کالج، کان پور کا طالبِ علم تھا۔ پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب (صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ) انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری تھے (اس زمانے میں سکریٹری کا عہدہ اعزازی ہوا کرتا تھا اور انجمن کا صدر دفتر علی گڑھ میں واقع تھا)۔ موصوف سرور صاحب نے 1961 میں حلیم مسلم انٹر کالج، کان پور میں انجمن ترقی اردو کی ایک کُل ہند کانفرنس منعقد کی تھی۔ یادش بخیر، اردو کے روحِ رواں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب نے کراچی سے تشریف لا کر بہ نفسِ نفیس کانفرنس کو زینت بخشی تھی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنی حیاتِ مقدسہ کے نوّے برس پار کر چکے تھے۔ باوجود اس کے وہ اردو کے لیے مزید کچھ کر گزرنے کے جذبے سے سرشار تھے۔

مولوی عبدالحق، سرسیّد احمد خاں کے دورِ حیات میں ایم.اے.او کالج، علی گڑھ کے طالبِ علم تھے۔ سرسیّد ان کی سعادت مندی کی بنا پر خصوصی شغف فرماتے تھے۔ سرسیّد احمد خاں نے ان کی تربیت میں خاص دل چسپی لی تھی۔

اس موقعے پر یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ بہ حیثیتِ طالبِ علم، انجمن کی متذکرہ کانفرنس میں، مَیں نے حاضری دی تھی۔ اس طرح مجھے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ گویا:

'میری آنکھوں نے، اُن آنکھوں کو، دیکھا ہے، جن آنکھوں نے سرسیّد کی آنکھوں کو دیکھا ہے۔'

احمد مکرم
86، سنگم وہار کالونی، جھانسی-284003
Mob. No. 09936151358

معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ کا اظہارِ تعزیت

نئی دہلی (پریس ریلیز، 9 مئی)۔ اردو کے نامور ادیب اور افسانہ نگار سلام بن رزاق کے سانحۂ ارتحال سے ادبی معاشرہ صدمے میں ہے۔ اردو کے معروف ادارے غالب انسٹی ٹیوٹ نے ان کے انتقال پر شدید غم و افسوس کا اظہار کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سلام بن رزاق ہمارے عہد کے نمائندہ نثر نگاروں میں تھے۔ انھوں نے اپنے افسانے، خاکے اور ترجمے کے ذریعے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ انھیں دو بار ساہتیہ اکادمی ایوارڈ پیش کیا گیا، ایک مرتبہ ان کے افسانوں کے لیے اور دوسری مرتبہ ترجمے کی خاطر۔ 2013 میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے انھیں غالب انعام برائے اردو نثر پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے ایک فعال زندگی گزاری، ان کے انتقال سے اردو ادب کا بڑا خسارہ ہوا ہے۔ میں اپنی اور ادارے کی جانب سے ان کے پسماندگان اور پورے ادبی سماج کو تعزیت پیش کرتا ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سلام بن رزاق پیشے سے ایک استاد تھے لیکن انھوں نے صرف درس و تدریس تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ ان کے افسانے، ڈرامے اور ترجمے ادبی دنیا میں بطورِ معیار پیش کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے فلموں اور سیریلوں کے لیے بھی اپنی قلمی خدمات پیش کیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات اور کردار ہماری روز مرہ کی زندگی سے گہری وابستگی رکھتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب ہمارے مسائل ہی ہیں۔ اس غم کی گھڑی میں ادارہ ان کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور میری دعا ہے کہ خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

پروفیسر منال شاہ القادری

کلکتہ۔ مغربی بنگال کی مشہور علمی، ادبی اور مذہبی شخصیت پروفیسر منال شاہ القادری کا 22 مئی 2024 کو انتقال ہوگیا۔ ان کا تعلق مدناپور سے تھا اور وہ وہاں کے پیر بھی تھے۔ وہ کلکتہ یونی ورسٹی میں شعبۂ فارسی اور عربی کے صدر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے تھے۔ حکومتِ ہند نے انھیں ازبکستان کا سفیر بھی مقرر کیا تھا، یہاں بھی انھوں نے اپنے نقوشِ قدم مرتسم کیے تھے۔ بعد میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے وائس چیئر مین بھی ہوئے اور بہت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ اِدھر کئی برسوں سے مستقل ان کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی مگر پھر بھی لوگوں اور مریدوں سے ملنا جلنا جاری تھا۔ گذشتہ ہفتے ان کی طبیعت زیادہ علیل ہوگئی تو انھیں نرسنگ ہوم میں داخل کیا گیا مگر وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 85 برس تھی۔ ان کی نمازِ جنازہ 23 مئی کو بعد نمازِ ظہر تالتلا لین خانقاہ شریف میں ادا کی گئی اور وہاں سے انھیں ان کے آبائی وطن مدناپور لے جایا گیا جہاں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔

ڈاکٹر شاداب ذکی

بدایوں۔ اردو کے مشہور و ممتاز شاعر اور ادیب ڈاکٹر شاداب ذکی کا طویل علالت کے بعد 26 مئی 2024 کو انتقال ہوگیا۔ انھوں نے تقریباً 60 برس کی عمر میں آخری سانس لی۔ شاداب ذکی کافی عرصے سے صاحبِ فراش تھے اس کے باوجود انھوں نے اپنی علمی و تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ وہ کئی برسوں سے چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ گذشتہ دنوں طبیعت زیادہ ناساز ہونے کی وجہ سے علی گڑھ میں زیرِ علاج رہے۔ شاداب ذکی کے انتقال سے بدایوں کے ادبی و علمی حلقوں میں رنج و غم کا ماحول ہے۔ دورِ حاضر کے نعت گو شعرا میں ڈاکٹر شاداب ذکی کا ایک اہم مقام تھا۔ انھوں نے اپنے والد اور مشہور شاعر ذکی تالگانوی کے علمی ورثے کو بہ خوبی سنبھالا اور آگے بڑھایا۔ ان کی ادارت میں سہ ماہی 'ابر' بھی کافی مقبول رسالہ شائع ہوتا رہا۔

انھوں نے کثرت سے حمدیں اور مناجاتیں کہیں اور عشقِ نبی میں ڈوب کر لکھیں۔ حال ہی میں ان کا نعتیہ دیوان 'سرکار کی باتیں' شائع ہوا۔ اس میں 40 حروف کو ردیف بنا کر کہی گئی نعتیں شامل ہیں۔ اس سے قبل 2012 میں شائع حمدیہ دیوان 'رب کے حضور' میں 36 حروف کو ردیف بنا کر حمدیں کہی تھیں۔ 2006 میں شائع حمدیہ مجموعہ 'للہ الحمد' قبولِ عام حاصل کر چکا ہے۔

پروفیسر محمد حسین آزاد

موتیہاری۔ مشہور سماجی و ادبی شخصیت پروفیسر محمد حسین آزاد کا 67 برس کی عمر میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ مشرقی چمپارن ضلع کے کلیان پور بلاک کے میگھوا گاؤں کے باشندہ تھے مگر موتیہاری کے سلام نگر میں کچھ برسوں سے قیام پذیر تھے۔ طویل علالت کے بعد مورخہ یکم جون 2024 کو پٹنہ ایمس کے آئی سی یو میں علاج کے دوران اُن کا انتقال ہوگیا۔ وہ موتیہاری کے مہاراجا ہریندر کشور کالج میں شعبۂ اُردو میں استاد تھے۔ انھوں نے پٹنہ یونی ورسٹی سے ایم.اے اردو کیا تھا۔ ایل ایل بی کی سند بھی حاصل کی تھی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہیں۔ نمازِ جنازہ اور تدفین آبائی گاؤں میں 2 جون کو صبح دس بجے ادا کی گئی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : آئینۂ اظہار
مصنف : پروفیسر اظہار حیدری
ضخامت : 500 صفحات
قیمت : 800 روپے
ناشر : الجلیس، پاکستانی بکس پبلشنگ سروسز، کراچی
تبصرہ نگار : پروفیسر شاہد کمال
E-mail: shhdkamal@yahoo.com.
Mob. 923003739850

داغؔ دہلوی کی روایت کا جو تسلسل ہم تک آیا ہے اُس میں دو اہم نام نازش حیدری اور انور دہلوی ہیں۔ یہ دونوں بھائی اپنے عہد میں ایک منفرد مقام کے حامل رہے۔ اسی خانوادے میں انور دہلوی کے گھر ممتاز ترقی پسند شاعر اظہار حیدری کا جنم ہوا۔ آپ پڑھے لکھے اور روشن خیال ادیب تھے۔ شاعری کے علاوہ تدریسِ ادب اور مخصوص نظریاتی اساس کے اظہار نے آپ کو دوسروں سے منفرد حیثیت عطا کی۔ زیرِ نظر کتاب 'آئینۂ اظہار' آپ کے شائستہ زورِ قلم کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس میں 84 مختصر مضامین شامل ہیں جو ایک خاص نظریاتی تاثر کے عکاس ہیں۔ ہر چند کہ ان مضامین میں مختلف موضوعات کے علاوہ شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے اہلِ قلم پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے لیکن وہ بھی ایک خاص طرح کے سیاسی اور عمرانی پس منظر کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر معروف شاعر شکیل احمد ضیاؔ پر لکھے گئے مضمون میں شاعری کے بہ جاے اُن کی سیاسی کتاب 'سندھ کا مقدمہ' کا مقدمہ لڑا گیا ہے، جو اُن کے شفاف سیاسی شعور کی شہادت ہے۔

اس کتاب کے متعدد مضامین برِّصغیر کے سیاسی تغیرات کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جن کا انداز صحافیانہ ہے، لیکن اُنھیں پڑھ کر قاری کا تسلسل عہد رفتہ کے سیاسی منظر نامے سے جُڑ جاتا ہے اور اس مخصوص اکھاڑ پچھاڑ کی گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں۔ ان مضامین میں 'آشوبِ چشم پوشی' اور 'بگلہ بھگت چوزے'، 'صیہونیت کا تکیہ اور رچرڈ نکس کا بغیہ' قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی تعلق سے لکھے گئے مضامین میں 'کامریڈ سجاد حسین'، 'شوکت صدیقی'، 'جوشؔ ملیح آبادی'، 'جون ایلیا' اور 'رسا چغتائی' پر لکھے گئے مضامین قاری کی توجہ کو متزلزل نہیں ہونے دیتا۔

اظہار حیدری کی اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام اُن کی صاحبزادی صدف بن اظہار کی سعیِ پیہم کا ثمرہ ہے جو خود بھی نہایت خوش فکر شاعرہ ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب قارئین میں قبولیت کا درجہ حاصل کرے گی۔

◆◆◆

بقیہ: مغرب میں انشائیے کی روایت

(صفحہ 2 سے آگے)

بیکن کا مشہور انشائیہ 'کتابیں پڑھنا' اس موضوع پر حکمت سے پُر اور تجربات پر مبنی حقائق کو دل چسپ انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس مضمون کے کئی فقرے انگریزی ادب کا محاورہ بن چکے ہیں۔ بیکن اپنے مضمون 'کتابیں پڑھنا' میں جہاں کتابوں کی قسمیں انوکھے انداز میں گنواتا ہے اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے وہیں مطالعہ کے متعلق بھی عام روش سے ہٹ کر اپنی رائے ظاہر کرتا ہے:

> 'چالاک آدمی مطالعے کی تحقیر کرتا ہے۔ سادہ انسان کتاب بینی کو تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اہلِ خرد مطالعے سے استفادہ کرتے ہیں، لیکن واضح رہے کہ مطالعہ فی نفسہٖ استعمال کی چیز نہیں بلکہ اس سے بالاتر وہ دانش ہے جو تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے۔ کتاب کو اس خیال سے نہ پڑھیے کہ اس کے مطالعے سے آپ کسی مسئلہ کی تردید یا بطلان کرسکیں گے۔ کسی چیز پر مہرِ تسلیم و رضا ثبت کرنے یا اپنے ایقان کو اثبات فراہم کرنے کے لیے بھی مطالعہ نہیں کرنا چاہیے۔ مطالعے کا مقصد معاملہ بندی یا چرب زبانی بھی نہیں ہے بلکہ مطالعہ تو صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ آپ کی فکر بیدار ہو اور آپ تقابل و موازنہ کرسکیں۔'[۱۰]

بیکن کے بعد دنیا بھر میں ابھرنے والے انشائیہ نگاروں میں تھامس اوبری (1581–1613)، جانسن (1573–1637) اور جان اورویل (1601-1665) قابلِ ذکر ہیں۔ یہ Aphoristic انشائیہ نگار تھے جن کے ہاں عصری زندگی کی تصویر کشی کا رجحان نظر آتا ہے۔ نیز ان کے ہاں حقائق کی قطعیت کو تخیل کی لطافتوں سے صیقل کیا گیا ہے۔ انھوں نے اظہارِ ذات کے لیے کرداروں کو اولیت دی جو بیک وقت عصری زندگی کی نمائندگی کے علاوہ مصنف کی پسند یا ناپسند کی آئینہ دار بھی ہے۔

ابراھم کاولے Abraham Cowley (1618-1667)

انگریزی ایسّے ابتدا ہی سے مانتین کے اظہارِ ذات کے عمل سے انحراف کا عادی رہا ہے۔ اگر اسی سمت اس کی پیش قدمی جاری رہتی تو عین ممکن تھا کہ انگریزی انشائیہ اس کے اصل مزاج سے دور ہو جاتا لیکن بیکن کے بعد اسے ابراہم کاولے جیسا انشائیہ نگار مل گیا جس نے خود انکشافی کے عمل کو اس صنف میں ترجیح دے کر مانتین کے انشائیہ کی اصل روح کو انگریزی میں زندہ کیا۔ ابراہم کاولے بنیادی طور پر شاعر تھا۔ مابعد الطبعیاتی شعرا (Metaphysical Poets) میں ابراہم کاولے کا شمار کیا جاتا ہے۔ شاعری کی بہ نسبت اس کے انشائیے زیادہ مقبول ہوئے۔ معدودے چند انشائیے تحریر کرنے کے باوجود اس کی تحریروں نے انگریزی انشائیوں کو جو سمت عطا کی اس کے پیشِ نظر ابراہم کاولے انگریزی ایسّے کا ایک اہم نام شمار کیا جاتا ہے۔ جس طرح مانتین کے انشائیے اپنے تخلیقی ابال اور اظہارِ ذات کے نتیجے میں وجود میں آئے تھے، اسی طرح خود انکشافی کے عمل سے ابراہم کاولے کے انشائیے بھی روشن ہوئے۔ اس کی نثر پر اس کی شاعرانہ شخصیت کی چھاپ اس قدر گہری ہے کہ اس کی حدیں غنائیت سے جا ملتی ہیں۔

ابراہم کاولے کی تحریروں میں خود کلامی، انکشافِ ذات اور غنائیت کے باہمی امتزاج نے جو اسلوب انگریزی انشائیے کو عطا کیا اس کے پیشِ نظر ابراہم کاولے کو انگریزی انشائیہ نگاروں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ غلام جیلانی اصغر اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> کوئی انشائیہ جس میں انشائیہ نگار کی ذات موجود نہ ہو ایک تاریخی یا تنقیدی انشائیہ تو کہلا سکتا ہے لیکن وہ انشائیہ کے اصل مزاج کے قریب نہیں اور اگر اس کلیہ کو تسلیم کرلیا جائے تو انگریزی ادب میں بیکن پہلا انشائیہ نگار نہیں بلکہ ابراہم کاولے ہے، جس نے انشائیہ کے منفرد مزاج کو سمجھا اور اس کا انشائیہ 'کچھ اپنے بارے میں'، Of myself اس مزاج کی پوری عکاسی کرتا ہے''۔[۱۱]

اپنے متعلق Of My self میں ابراہم کاولے رقم طراز ہیں۔

''یہ قدرے مشکل بھی ہے اور اچھا موضوع ہے، کسی شخص کے لیے کہ وہ اپنے متعلق اظہارِ خیال کرے۔ سامعین اگر کسی کی کمزوریاں سن کر بھی تعریف کرنے کے لیے تیار ہوں تو اس سے زیادہ حوصلہ افزا اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ اس میں کسی دوسرے کو موردِ الزام قرار دینے کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ نہ میرا جسم نہ روح نہ میری تقدیر مجھے اجازت دیتی ہے کہ خود نمائی کے لیے میں ایسی کوئی بات پیش کروں۔ میرے تسکینِ قلب کے لیے یہ کافی ہے کہ انھوں نے مجھے کسی شرمناک فعل میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھا۔'

.....جاری.....

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق و توازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
حلمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سر اُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-
سیر المنازل (مرزا سنگین بیگ)	شریف حسین قاسمی	600/-
محرابِ تمنا	فطرت انصاری	200/-
مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر...	میر حسین علی امام، یاسمین سلطانہ فاروقی	700/-
لفظ (کلیاتِ زہرا نگاہ)	زہرا نگاہ	500/-
In This Live Desolation (Autobiography of Akhtarul Iman)	ترجمہ: بیدار بخت	500/-
سخنِ افتخار (کلیاتِ افتخار عارف)	افتخار عارف	1500/-
گواہی (شاعری)	گوہر رضا	500/-
میری زمین کی دھوپ (ہندی)	ونود کمار ترپاٹھی بشرؔ	400/-
کھلا دروازہ	ڈاکٹر نریش	250/-
ٹیپو سلطان کا خواب (گریش کرناڈ)	محبوب الرحمان فاروقی	300/-
اپنی دنیا آپ پیدا کر	غلام حیدر	900/-
وقائعِ بابر	ظہیر الدین محمد بابر	1000/-
In This Poem Explanateions of Many Modern Urdu Poem (میراجی)	بیدار بخت	600/-
میری زمین کی دھوپ	ونود کمار ترپاٹھی بشرؔ	600/-
اُردو شاعرات اور نسائی شعور	ڈاکٹر فاطمہ حسن	330/-
مجھے اک بات کہنی ہے	شاہد کمال	400/-
انتخابِ غالب	امتیاز علی عرشی	600/-
باغِ گلِ سرخ	افتخار عارف	300/-
رفتگاں کا سراغ	سرور الہدیٰ	450/-
کلّیاتِ مصطفیٰ زیدی	سرور الہدیٰ	900/-
اے زمین وطن اور دیگر مضامین	ڈاکٹر نریش	225/-
ارمغانِ علی گڑھ	پروفیسر خلیق احمد نظامی	400/-
تاریخ و آثارِ دہلی	معین الدین عقیل	100/-
مجموعۂ سلام مچھلی شہری	بیدار بخت	700/-
کستوری کُنڈل بسے	ڈاکٹر نریش	250/-

بقیہ: بیانِ شبلی

(صفحہ 8 سے آگے)

نے اس پر جو مختصر سا دیباچہ لکھا ہے، اس سے نہ صرف اس کی اہمیت اورضرورت کا احساس ہوتا ہے بلکہ خود ان کی عمدہ نثر کا ایک نمونہ بھی سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد مسلمان نہ صرف سیاسی حیثیت سے بلکہ مذہبی وتہذیبی لحاظ سے بھی بہت پستی کی حالت میں آگئے تھے۔ سرسید پہلے شخص تھے جنھیں مسلمانوں کی اس زبوں حالی کا احساس ہوا اور انھوں نے اپنی ساری عمر اپنی قوم کو پستی سے بلندی کی طرف لانے کی کوشش کی۔ سرسید نے جو کام شروع کیا تھا وہ اہم بھی تھا اور وسیع بھی۔ اس کو انجام دینے کے لیے انھیں متعدد رفقا کی ضرورت تھی۔ ان کے رفقا میں مولانا شبلی کا نام سب سے اہم اور نمایاں ہے۔ مولانا نے مسلمانوں کی حیات بخش روایات کو زندہ رکھتے ہوئے موجودہ عہد کے تقاضوں کی تکمیل کی بھی پوری کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد جو پود تیار ہوئی اس نے سب سے زیادہ شبلی کا اثر قبول کیا اور آج بھی انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ اثر شبلی ہی کا ہے۔ ایسے محسنِ قوم کے حالات اور کارناموں سے واقفیت ہمارے تہذیبی فرائض میں داخل ہے۔ مولانا شبلی کی بڑی مبسوط سوانح عمری ان کے شاگردِ رشید اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے 'حیاتِ شبلی' کے نام سے لکھی ہے، لیکن یہ ایک علمی کتاب ہونے کے علاوہ بڑی ضخیم بھی ہے اور اس سے اسکول کے طلبہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس ضرورت کے پیشِ نظر ہم نے 'حیاتِ شبلی' کا یہ خلاصہ تیار کیا ہے۔ امید ہے کہ اسے پسندیدہ نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

خلاصہ تیار کرنے میں مصنف کی عبارت میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ صرف وہ عبارتیں اور باتیں جن سے مدارس کے طلبہ کو دلچسپی نہیں ہوسکتی یا ان کی فہم سے بالاتر ہیں حذف کردی گئی ہیں۔' (ص: د)

تدوینات مکاتیبِ شبلی: تقابلی جائزہ

اردو کے مکتوباتی ادب میں علامہ شبلی نعمانی کا بڑا اہم حصہ ہے۔ مرزا غالب کے بعد وہ دوسرے اہم مکتوب نگار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مکتوبات تمام اہلِ علم ودانش نے سنبھال کر رکھے تھے، جنھیں اولاً مولانا سید سلیمان ندوی نے دوجلدوں میں دارالمصنّفین سے شائع کیے، اس کے بعد منشی امین زبیری نے عطیہ فیضی اور زہرہ فیضی کے نام کے خطوط شبلی شائع کیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام علامہ شبلی کے 40 خطوط مکاتیبِ شبلی حصہ اول میں شامل ہیں۔ ان کو اصل متن اور مزید خطوط کے اضافوں کے ساتھ علاحدہ 'خطوطِ شبلی بنام آزاد' کے نام سے سید محمد حسنین نے کتابی صورت میں اردو اکادمی بہار سے شائع کرایا۔ اس کے بعد ناچیز نے علامہ شبلی کے متفرق اور نو دریافت خطوط 'مکتوباتِ شبلی' کے نام سے دسمبر 2012 میں شائع کیا۔ اب مزید اضافوں کے ساتھ اس کا دوسرا اڈیشن دارالمصنّفین نے شائع کیا ہے۔ اس کے بعد بھی چند اور متفرق خطوط ہاتھ آئے، جس سے علامہ شبلی کے دستیاب خطوط کی تعداد 1229 ہوگئی ہے۔

ضرورت تھی کہ ان تمام مجموعہ ہائے مکاتیبِ شبلی کا یکجا مطالعہ وجائزہ پیش کیا جائے۔ مطالعۂ شبلی کی یہ خدمت ایک بڑے شبلی شناس اور متعدد کتابوں کے مصنف ڈاکٹر خالد ندیم صاحب سابق صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا کے ذہن میں آئی۔ چناں چہ انھوں نے اردو کی ایک طالبہ نمرہ احمد کو اس کام پر آمادہ کیا اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی نگرانی میں 'تدوینات مکاتیبِ شبلی: تقابلی جائزہ' کے عنوان سے 2021-23 کے لیے ایم فل کا مقالہ لکھا اور شعبۂ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا میں سند کے لیے جمع کیا ہے۔ اس کے ابواب ومشمولات درج ذیل ہیں:

پیش لفظ
باب اول : تدوینات مکاتیبِ شبلی کی روایت
باب دوم : مکاتیبِ شبلی (سید سلیمان ندوی) کی تدوین
باب سوم : خطوطِ شبلی (محمد امین زبیری) کی تدوین
باب چہارم : مکتوباتِ شبلی (محمد الیاس الاعظمی) کی تدوین
باب پنجم : خطوطِ شبلی بنام شروانی (فیصل احمد ندوی) کی تدوین
محاکمہ/کتابیات

مکاتیبِ شبلی کے اس جدید مطالعے سے یقین ہے کہ شبلی فہمی کا ایک قدم اور آگے بڑھے گا اور تفہیم شبلی میں آسانی ہوگی۔ یہاں یہ بات سخن گسترانہ نہ ہوگی کہ علامہ شبلی کے افکار وخیالات کا اصل مخزن 'مقالاتِ شبلی' کے علاوہ 'مکاتیبِ شبلی' ہی ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی: شخصیت اور ادبی خدمات

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل کا یہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی 2023 میں شائع ہوا ہے۔ اس پر انھیں لکھنؤ یونیورسٹی نے 1981 میں ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی تھی۔ 536 صفحات پر مشتمل اس ضخیم مقالہ کی قیمت ایک ہزار روپے ہے۔

یہ مقالہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

باب اول: ابتدائی نشوونما تشکیل فکر، تعلیم وتربیت، ماحول اور سماجی قدریں
باب دوم: سرسید تحریک اور اس کے اثرات
باب سوم: شبلی دیار سرسید میں
باب چہارم: تحریک ندوۃ العلما پس منظر اور مولانا شبلی کی شرکت
باب پنجم: شبلی اپنے آستانہ پر
باب ششم: شبلی بحیثیت مورخ
باب ہفتم: شبلی بحیثیت نقاد
باب ہشتم: شبلی بحیثیت شاعر
باب نہم: شبلی کے مکاتیب وخطوط
باب دہم: شبلی کی مجموعی قدر وقیمت

شروع میں فاضل مصنف کی رودادِ سفر اور خلاصۂ فکر، دو تحریریں ابتدائیہ کے طور پر شامل ہیں۔ پیش لفظ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے سابق ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے لکھا ہے جب کہ مقدمہ ڈاکٹر عبداللہ عباس مرحوم سابق معتمدِ تعلیم ندوۃ العلما کے قلم سے ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ دونوں عالمانہ اور انتہائی شاندار تحریریں مقالے کی وقعت اور اہمیت میں اضافہ کا باعث ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی نثر تو اپنے خاص اسلوب کے لیے معروف ہی ہے، ڈاکٹر عبداللہ عباس مرحوم نے جو خوب صورت نثر لکھی ہے اور جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ مطالعۂ شبلی میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ نثر ندوہ کے معتمدِ تعلیم جس عہدہ پر سب سے اول علامہ شبلی فائز ہوئے تھے، ان کے جانشین ہی کے قلم سے وجود میں آسکتی تھی اور بلاشائبہ مبالغہ انھوں نے اپنا حق ادا کردیا ہے۔

مصنف ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی ہمارے عہد کے نامور اہلِ قلم، مفکر ودانش ور اور ماہرِ تعلیم ہیں۔ پوری عمر خدمتِ علم وادب اور تعلیم وتہذیب کی خدمت میں گذری ہے۔ ان کا یہ مقالہ جس کے تفصیلی مطالعے کی یہاں گنجائش نہیں، بس سرسری طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مقالہ مطالعۂ شبلیات میں اپنے مشمولات ومباحث اور اسلوبِ نگارش ہر دو لحاظ سے گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کی اشاعت پر فاضل مصنف کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اپنی ذات سے متعلق مصنف کے نیک جذبات کے لیے بے حد ممنون ہوں۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
شائستہ منزل، 641، پورہ غلامی، عقب آواس وکاس،
اعظم گڑھ-276001، یوپی
E-mail: azmi408@gmail.com, Mob. 9838573645

بقیہ: علامہ اقبال مساواتِ انسانی کے علم بردار

(صفحہ 3 سے آگے)

خیال میں ماضی کے واقعات وحوادث کے اسباب وعلل کو سمجھنے اور ان کے باہمی ربط وتعلق کو جاننے نیز اس کی روشنی میں افراد واقوام کے عروج وزوال کے اصول اخذ کرنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔ اقبال نے دنیا میں جاری نظاموں کا بغور مطالعہ کیا ہے، ان نظاموں کی خوبیاں وخرابیاں آشکار کرکے بتایا کہ جب فرد کا فرد کے درمیان فاصلہ باقی نہ رہے تو معاشرہ ایک خود کار مشین میں ڈھل کر ارتقا کے پورے سلسلے کو منقطع کردیتا ہے۔ اسی طرح جب فرد اور فرد کے درمیان کا فاصلہ بہت زیادہ بڑھ جائے تو بکھرنے اور لخت لخت ہونے کا عمل وجود میں آتا ہے نیز ایک ایسا استحصالی نظام جنم لیتا ہے، جس میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ اقبال نے انسانوں کے لیے ایک ایسے سماج کا خواب دیکھا جس میں توازن ہو، عشق کے ساتھ عقل مل کر ارتقا کی طرف گامزن رہے، ان کے نزدیک یہی انسانیت کی معراج ہے۔ اقبال کی فکر کا سرمایہ تقریباً بیس ہزار اشعار پر محیط ہے اور اشعار کی بڑی تعداد ایسی ہے جو آفاقی نوعیت کے حامل ہیں انھیں کسی خاص عہد کے تناظر میں نہیں سمجھا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے اشعار معنوی لحاظ سے اپنے عہد میں جتنے اہم تھے اتنے ہی آج بھی ہیں اور آج سے زیادہ کل ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر فکرِ اقبال کی اہمیت ومقبولیت وقت کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔

عارف عزیز
20-گھاٹی بھڑبھونجہ روڈ، تلیا، بھوپال-462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

سخنِ افتخار
(کلیاتِ افتخار عارف)
افتخار عارف
قیمت: 1500 روپے

بیانِ شبلی

محمد الیاس الاعظمی

'بیانِ شبلی' حصۂ چہارم کی اشاعت اور حصۂ پنجم کی تیاری کے درمیانی عرصے میں مطالعاتِ شبلی کی بعض قدیم وجدید اور نادر کاوشوں کا علم ہوا، جن کا اندراج ناچیز کی مرتبہ 'کتابیاتِ شبلی' میں نہیں ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں انہی کتب ورسائل کا ذکر مطلوب ہے۔

سیرۃ الفاروق یعنی خلاصۃ الفاروق

علامہ شبلی کی شہرۂ آفاق کتاب 'الفاروق' کے متعدد زبانوں میں تراجم اور تلخیصات شائع ہوچکی ہیں، جن کی تفصیل 'تصانیفِ شبلی کے تراجم' میں آچکی ہے۔ حال میں 'الفاروق' کی ایک اور تلخیص کا پہلی بار علم ہوا۔ یہ تلخیص مولوی محمد عبداللہ نثار منشی فاضل، پروفیسر دارالعلوم السنہ شرقیہ لاہور کے قلم سے ہے۔ 72 صفحات پر مشتمل 'الفاروق' کی یہ تلخیص ظفر بک ڈپو اندرون لوہاری گیٹ، لاہور سے 1936 میں شائع ہوئی ہے۔

خلاصہ بے نظیر از موازنۂ انیس ودبیر

علامہ شبلی کی مشہور ومقبول ترین کتاب 'موازنۂ انیس ودبیر' 1907 میں پہلی بار لکھنؤ سے شائع ہوئی، یہ مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصابِ تعلیم میں شامل رہی ہے اور آج بھی بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ان میں پنجاب یونیورسٹی لاہور اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اسے پچاسوں اشاعتی اداروں نے متعدد بار شائع کیا۔ طلبہ کی سہولت کے مقصد سے اس کی متعدد تلخیصات کی گئیں۔ کئی تلخیصات کا ذکر 'بیانِ شبلی' کی دوسری جلدوں میں آچکا ہے۔ حال میں اس کی ایک اور تلخیص بنام 'خلاصہ بے نظیر از موازنۂ انیس ودبیر' دستیاب ہوئی ہے۔ یہ تلخیص شیخ جان محمد الٰہ بخش تاجرانِ کتبِ علومِ مشرقی کشمیری بازار، لاہور کی فرمائش پر مولوی سید عوض علی درمان (نوگانوی) منشی فاضل نے کی ہے اور 'پروفیسی ان اردو' پنجاب یونیورسٹی لاہور اور منشی اگزامینیشن آف الٰہ آباد کے لیے کی ہے۔ اسے شیخ جان محمد الٰہ بخش پبلشر نے اکتوبر 1936 میں حجازی پریس لاہور سے حافظ محمد اسماعیل کے اہتمام میں طبع کرایا ہے۔ البتہ یہ تلخیص محض 48 صفحات پر مشتمل ہے۔

تلخیص سیرۃ النبیؐ

سیرۃ النبی کی یہ تلخیص احسان بی اے کے قلم سے ہے۔ مقبول اکیڈمی لاہور نے شائع کیا ہے۔ سنہ طباعت درج نہیں ہے۔ معروضات کے عنوان سے مقدمۂ کتاب میں سیرت اور سیرت نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ سیرۃ النبیؐ میں علامہ شبلی نے مستشرقین کی کتب اور ان کے خیالات کا جو تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس کا بھی مقدمے میں ذکر کیا گیا ہے۔ خاص اردو زبان کی سیرت نگاری کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور تلخیص نگار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

'ان تمام عظیم الشان خدمات اور قابلِ احترام مساعی کے باوجود مولانا شبلی نعمانی کی 'سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم' کو جو قبولِ عام نصیب ہوا اُسے صرف اللہ کی دین ہی کہا جاسکتا ہے۔ عوام نے تو اسے سرآنکھوں پر جگہ دی ہی تھی، سیرتِ شریفہ کے مختلف پہلوؤں کے ماہرین نے بھی اپنے علم کے مطابق اس کے مختلف پہلوؤں کو جانچا اور پرکھا۔ اہلِ علم میں اس کی مقبولیت مسلم ہے۔' (تلخیص سیرۃ النبی ص25)

تلخیص نگار کا خیال ہے کہ معاشرے کی اصلاح وترقی کے لیے حیاتِ طیبہ سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ ان کا یہ بھی خیال ہے:

'مستشرقین نے جو کچھ کیا وہ سیاست تھی اور عہد حاضر کے عقل پرست جو کچھ کررہے ہیں وہ سیاست نہیں سادگی اور کم علمی ہے۔ اس خطرناک تر دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا سادہ ترین اور دلنشیں ترین صورت میں ہر گھر میں عام ہوجانا بے حد ضروری ہے۔ اس مقصد کی تکمیل مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی تالیف سے زیادہ کوئی دوسری تالیف احسن طریقے سے نہیں کرسکتی۔ اللہ تعالی نے اسے مقبولیت کے جن درجات پر فائز کیا ہے وہ اس مقصد کی سمت بڑھنے کے لیے پہلا کامیاب قدم بن سکتا ہے، اس لیے میری نظر بار بار اسی تالیف کی طرف اٹھتی تھی۔'

(تلخیص سیرت النبیؐ، ص26-25)

ان وجوہ واسباب سے احسان بی اے نے علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کی تلخیص کا عزم کیا اور اس کے علمی مباحث اور مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات حذف کرکے یہ تلخیص تیار کی۔ اس میں تلخیص نگار نے اپنی جانب سے ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔ البتہ جہاں کسی قسم کی تشنگی محسوس کی ہے وہاں حواشی لکھ دیے ہیں، جس میں علامہ شبلی کے بعد کے سیرت نگاروں کے بعض آرا وخیالات اور تحقیقاتِ علمی شامل کیے ہیں۔ اس تلخیص کا مقصد بقولِ تلخیص نگار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مستند سیرت کو ہر گھر میں پہنچانے کی ایک کوشش بتایا ہے۔ (ایضاً ص28)

خلاصہ 'حیاتِ شبلی'

اہلِ علم بخوبی واقف ہیں کہ علامہ شبلی (1857-1914) کی حیات وخدمات اور کارناموں کا دائرہ بے حد وسیع، متنوع اور گوناگوں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے لائق شاگرد اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی (1884-1953) نے جب ان کی سوانح عمری 'حیاتِ شبلی' لکھی تو وہ تقریباً نو سو صفحات میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، حیاتِ شبلی نہ صرف ضخامت بلکہ علمی وفنی اور معلومات ومباحث کے لحاظ سے بھی اردو کی ایک منفرد سوانح حیات ہے۔ خود سید صاحب نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

'یہ نو سو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلے میں بہت سے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں، جن کو اس عہد کے سمجھنے کے لیے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں دیارِ مشرق میں علومِ اسلامیہ کی تعلیم واشاعت کی تاریخ ہے جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے۔' (حیاتِ شبلی:10)

'حیاتِ شبلی' سے پہلے سرسید کی سوانح عمری 'حیاتِ جاوید' اردو کی سب سے اہم اور ضخیم سوانح عمری خیال کی جاتی تھی، لیکن بقولِ شیخ محمد اکرام 'سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاجِ فضیلت چھین لیا، جو حیاتِ جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا۔' (شبلی نامہ، ص11)

اس اہمیت اور ضخامت کی وجہ سے 'حیاتِ شبلی' عام لوگوں بالخصوص طلبہ کی دسترس سے باہر تھی، چناں چہ اس سے افادۂ عام کی غرض سے تلخیص کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یہ کام اعظم گڑھ کے ایک مایۂ ناز فرزند اور دبستانِ شبلی کے نامور محقق ومصنف عبدالرزاق قریشی مرحوم نے انجام دیا اور 1960 میں اس کا خلاصہ شائع کیا۔ اس خلاصے کا لوگوں کو علی العموم علم نہیں ہے۔ عبدالرزاق قریشی صاحب نے ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***